سنہ ۶

مشتاق احمد یوسفی

اوروں کا حال معلوم نہیں، لیکن اپنا تو یہ نقشہ رہا کہ کھیلنے کھانے کے دن پانی پت کی لڑائیوں کے سن یاد کرنے، اور جوانی دیوانی نپولین کی جنگوں کی تاریخیں رٹنے میں کٹی۔ اس کا قلق تمام عمر رہے گا کہ جو راتیں سکھوں کی لڑائیوں کے سن حفظ کرنے میں گزریں، وہ ان کے لطیفوں کی نذر ہو جاتیں تو زندگی سنور جاتی۔ محمود غزنوی لائقِ صد احترام سہی، لیکن ایک زمانے میں ہمیں اس سے بھی یہ شکایت رہی کہ سترہ حملوں کی بجائے اگر وہ جی کڑا کر کے ایک ہی بھرپور حملہ کر دیتا تو آنے والی نسلوں کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ پیدا ہی نہ ہوتیں (ہمارا اشارہ مشکلات کی طرف ہے)۔

اولادِ آدم کے سر پر جو گزری ہے، اس کی ذمہ داری مشاہیرِ عالم پر عائد ہوتی ہے۔ یہ نری تہمت طرازی نہیں بلکہ فلسفۂ تاریخ ہے، جس سے اس وقت ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ بنی نوعِ آدم کو تواریخ نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا مورخین نے۔ انھوں نے اس کی سادہ اور مختصر سی داستان کو یادگار تاریخوں کا ایک ایسا کیلنڈر بنا دیا جس کے سبھی ہندسے سرخ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ طلبا بوجوہ معقول ان کے حق میں دعائے مغفرت نہیں کر سکتے اور اب ذہن بھی ان تعیناتِ زمانی کا اس حد تک خوگر ہو چکا ہے کہ ہم وجودِ انسانی کا تصور بلا قیدِ سن و سمبت کر ہی نہیں سکتے

''جو سن نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے، جو ہم نہ ہوتے تو غم نہ ہوتا''

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مورخین سن کو ایک طلسمی طوطا سمجھتے ہیں جس میں وقت کے ظالم دیو کی روح مقید ہے۔ کچھ اسی قسم کے عقیدے پر میل بورن کے خضر صورت آرچ بشوپ مانکس نے تین سال پہلے طنز کیا تھا کہ جب ان کی ۹۳ ویں

سالگرہ پر ایک اخبار کے رپورٹر نے اپنی نوٹ بک نکالتے ہوئے بڑے گمبھیر لہجے میں دریافت کیا:

'' آپ کے نزدیک ۹۳ کی عمر تک پہنچنے کی اصل وجہ کیا ہے؟''

'' برخوردار! اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ میں ۱۸۶۴ میں پیدا ہوا تھا!''

اور کچھ مورخین پر ہی موقوف نہیں ۔ مارچ ۱۹۳۸ میں میٹرک کے امتحان سے کچھ دن قبل مرزا عبدالودود بیگ نے اس رازکو فاش کیا (ہرچندکہ طلبا اسے کھولا نہیں کرتے)کہ شقی القلب ممتحن بھی سن ہی سے قابو میں آتے ہیں۔ چنانچہ زیرک طالب علم ہر جواب کی ابتدا کسی نہ کسی سن سے کرتے ہیں۔ خواہ سوال سے اس کا دور کا تعلق بھی نہ ہو۔ ذاتی مشاہدے کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ ایسے ایسے غبی لڑکے جو نادرشاہ دُرّانی اور احمدشاہ ابدالی میں کبھی تمیز نہ کر سکے، آج تک چنگیز خاں کو مسلمان سمجھتے ہیں، محض اس وجہ سے فرسٹ کلاس آئے کہ انھیں قتلِ عام کی صحیح تاریخ اور پانی پت کی حافظہ شکن جنگوں کے سن ازبر تھے۔ خود مرزا، جو میٹرک میں بس اس وجہ سے اوّل آگئے کہ انھیں مرہٹوں کی تمام لڑائیوں کی تاریخیں یاد تھیں، پرسوں تک اہلیہ بائی کو شیواجی کی رانی سمجھے بیٹھے تھے۔ میں نے ٹوکا تو چمک کر بولے:

'' یعنی کمال کرتے ہیں آپ بھی! اگر شیواجی نے شادی نہیں کی تو نانا فرنویس کس کا لڑکا تھا؟''

ترقی یافتہ ممالک میں مارچ کا مہینہ بے حد بہار آفرین ہوتا ہے۔ یہ وہ رُت ہے جس میں سبزہ اوس کھاکھاکر ہرا ہوتا ہے اور ایک طرف دامنِ صحرا موتیوں سے بھر جاتا ہے تو دوسری طرف

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال

اس تمہیدِ دل پذیر سے میرا یہ مطلب نہیں کہ اس کے برعکس پس ماندہ ممالک میں اس مست مہینے میں پت جھڑ ہوتا ہے اور

بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے کھاد

توجہ صرف اس امر کی جانب دلانا چاہتا ہوں کہ برصغیر میں یہ فصلِ گل آبادی کے سب سے معصوم اور بے گناہ طبقے کے لیے ہر سال ایک نئے ذہنی کرب کا پیغام لاتی ہے، جس میں چار سال سے لے کر چوبیس سال کی عمر تک کے سبھی مبتلا نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ سالانہ امتحانوں کا موسم ہوتا ہے۔ خدا جانے محکمۂ تعلیم نے اس زمانے میں امتحانات رکھنے میں کونسی ایسی مصلحت دیکھی، ورنہ عاجز کی رائے میں اس ذہنی عذاب کے لیے جنوری اور جون کے مہینے نہایت مناسب رہیں گے۔ یہ اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ کلاسیکی ٹریجڈی کے لیے خراب موسم انتہائی ضروری تصور کیا گیا ہے۔

بات سے بات نکل آئی، ورنہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ اب جو پیچھے مڑ کے دیکھتا ہوں تو یک گونہ افسوس ہوتا ہے کہ عمرِ عزیز کی پندرہ سولہ بہاریں اور میوہ ہائے باغِ جوانی اسی سالانہ جانکنی کی نذر ہوگئیں۔ یادش بخیر! وہ سلونا موسم جس کو اگلے وقتوں کی زبان میں 'جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن' کہتے ہیں، شاہ جہاں کے چاروں بیٹوں کی لڑائیاں اور فرانس کے تلے اوپر اٹھارہ لوئیوں کے سنِ ولادت و وفات یاد کرنے میں بسر ہوا اور تنہا فرانس کا سفر کیا مذکور، برطانیہ کی تاریخ میں بھی چھ عدد جارج اور آٹھ آٹھ ایڈورڈ اور ہنری گزرے ہیں، جن کی پیدائش اور تخت نشینی کی تاریخیں یاد کرتے کرتے زبان پر کانٹے اور حافظے میں نیل پڑ گئے تھے۔ ان میں ہنری ہشتم سب سے کٹھن اور کٹھور نکلا۔ اس لیے کہ اس کی اپنی تخت نشینی کے علاوہ ان خواتین کی تاریخِ وفات بھی یاد کرنا پڑی جن کو اس نے اپنے اوپر حلال کر رکھا تھا اور جنھیں باری باری تختہ نصیب ہوا۔

قیاس کہتا ہے کہ تاریخی نام رکھنے اور تاریخ وفات کہنے کا رواج اسی مشکل کو حل کرنے کی غرض سے پھیلا ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی مدد سے حافظے کو ایسی تاریخیں یاد رکھنے میں آسانی ہوتی ہے، جن کا بھول جانا ہی بہتر ہوتا۔ بعض شعرا بہ نظرِ احتیاط ہر سال اپنا قطعۂ تاریخِ وفات کہہ کر رکھ لیتے ہیں تاکہ مرنے کی سند رہے اور وقت ضرورت پس ماندگان کے کام آئے۔ کون واقف نہیں کہ مرزا غالبؔ نے جو مرنے کی آرزو میں مرتے تھے، متعدّد بار اپنی تاریخِ رحلت کہہ کر شاگردوں اور قرض خواہوں کو خوامخواہ ہراساں کیا ہوگا۔ لیکن جب قدرت نے ان کو مرنے کا ایک سنہری موقع فراہم کیا

تو یہ کہہ کر صاف ٹال گئے کہ وبائے عام میں مرنا ہماری کسرِ شان ہے۔

مارچ 1942 کا ذکر ہے۔ بی۔اے کے امتحان میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔ میں روہیلوں کی لڑائیوں سے فارغ ہوکر مرزا عبدالودود بیگ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ جھوم جھوم کر کچھ رٹ رہے ہیں۔ پوچھا ''خیام پڑھ رہے ہو؟''

کہنے لگے ''نہیں تو! ہسٹری ہے۔''

'' مگر آثار تو ہسٹیریا کے ہیں!''

اپنی اپنی جگہ دونوں سچے تھے۔ انھوں نے غلط نہیں کہا، اگرچہ میرا خیال بھی صحیح نکلا کہ وہ شعر سے شغل فرما رہے ہیں۔ البتہ شعر پڑھتے وقت چہرے پر مِرگی کی سی کیفیت میں نے قوّالوں کے سوا کسی اور کے چہرے پر اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ پھر خود ہی کہنے لگے ''چلو ہسٹری کی طرف سے تو اب بے فکری ہوگئی۔ قبلہ نانا جان نے پچاس مشاہیر کی تاریخِ ولادت و وفات کے قطعے کہہ کر میرے حوالے کر دئے ہیں۔ جن میں سے آدھے حفظ کر چکا ہوں۔'' اس کے بعد انھوں نے تیمور لنگ کی پیدائش اور رنجیت سنگھ کی رحلت کے قطعات بطور نمونہ گا کر سنائے۔

گھر پہنچ کر تخمینہ لگایا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ فی کس دو قطعات کے حساب سے اس شاہنامہ ہند کے چار سو مصرعے ہوئے اور اس میں وہ ذیلی قطعات شامل نہیں جن کا تعلق دیگر واقعات و موضوعات (مثلاً جانا پرتھوی راج کا سوئمبر میں بھیس بدل کر اور لے بھاگنا سنجوگتا کو گھوڑے پر۔ آنا نادر شاہ کا ہندوستان میں واسطے لینے کوہ نور ہیرا برابر انڈے مرغابی کے۔ داخل ہونا واجد علی شاہ کا پہلے پہل مٹیا برج میں معہ چھ بیگمات کے اور یاد کرنا بقیہ بیگمات کو) یا تاریخی چُھٹ بھیّوں (ثانوی ہیرو) مثلاً رانا سانگا، ہیموں بقال، نظام سقہ وغیرہ سے تھا۔ ایک قطعہ میں تو ضلع جگت پر اُتر آئے تھے۔ یہ اس نیم تاریخی حادثے سے متعلق تھا، جب نورجہاں کے ہاتھ سے کبوتر اُڑ گیا اور جہانگیر نے اس کو (یعنی نورجہان کو) پہلی بار ''خصم گیں'' نگاہوں سے دیکھا۔

حالانکہ دماغی طور پر میں پانی پت کی لڑائیوں میں بری طرح زخمی ہوچکا تھا، لیکن آخری قطعہ کو سن کر میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کرلیا کہ امتحان میں باعزّت طریقے سے فیل ہونا اس اوچھے ہتھیار سے ہزار درجہ بہتر ہوگا۔ بہرحال مرزا نے ایک ہفتے بعد اس کلیدِ کامیابی کو امتحان میں بے دریغ استعمال کیا، جس میں انھیں دو دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی دُشواری تو یہ کاپی میں قطعات اور حروف ابجد کا حساب دیکھ کر کمرۂ امتحان کا نگراں، جو ایک مدراسی کرسچین تھا، باربار ان کے پاس لپک کر آتا اور سمجھاتا کہ اردو کا پرچہ کل ہے۔ مرزا جھنجھلاکر جواب دیتے کہ یہ ہمیں بھی معلوم ہے تو وہ نرمی سے پوچھتا کہ پھر یہ تعویز کیوں لکھ رہے ہو؟ پایانِ کار مرزا نے وہیں کھڑے کھڑے اس کو فنِ تاریخ گوئی اور استخراج سنین کے رموز و نکات سے غلط انگریزی میں آگاہ کیا۔ حیرت سے اس کا منہ ۷ کے ہندسہ کی مانند پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ حروف واعداد کو بہکی بہکی نظروں سے دیکھ کر کہنے لگا:

''تعجب ہے کہ تم لوگ ماضی کے واقعات کا پتہ بھی علمِ نجوم سے لگا لیتے ہو!''

اس مُجسّم دشواری کے علاوہ دوسری دقت یہ ہوئی کہ ابھی پانچوں سوالات کے جملہ بادشاہوں، راجاؤں اور متعلقہ جنگوں کے عدد اور سن بہ سہولت تمام نکلے بھی نہ تھے کہ وقت ختم ہوگیا اور نگراں نے کاپی چھین لی۔ بڑی منت وسماجت کے بعد مرزا کو کاپی پر اپنا رول نمبر لکھنے کی اجازت ملی۔

جیساکہ عرض کرچکا ہوں، مجھے سن یاد نہیں رہتا اور مرزا کو وہ واقعہ یاد نہیں رہتا جو اس سن سے متعلق ہو۔ فرض کیجئے۔ مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ فرانسیسی انقلابیوں نے کسی صدی کے آخر میں قلعہ باستیل کا محاصرہ کیا تھا۔ لیکن سن یاد نہیں آتا۔ اب مرزا کو یقیناً اتنا یاد ہوگا کہ ۱۷۷۹ میں کچھ گڑبڑ ضرور ہوئی تھی۔ لیکن کہاں ہوئی اور اور کیوں ہوئی، یہ وہ بغیر استخارہ کیے نہیں بتا سکتے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۲ ہی کا ذکر ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی کمزوری پر افسوس کررہے تھے اور لقمہ دیتے جاتے تھے۔ وہ اس طرح کہ وہ مجھے روس کی بیوہ ملکہ کیتھرینِ اعظم کا سنِ ولادت اور تاریخِ تاج پوشی وغیرہ بتا رہے تھے اور میں ان کو اس کے منہ بولے شوہروں کے نام رٹوا رہا تھا۔ اچانک مرزا بولے یار یہ بڑے آدمی مرکے

بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتے۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں

میں نے کہا ''کارلائل کا قول ہے کہ تاریخ مشاہیر کی سوانحِ عمری ہے۔''

کہنے لگے ''سچ تو کہتا ہے بچارا! تاریخ بڑے آدمیوں کا اعمال نامہ ہے جو غلطی سے ہمارے ہاتھ تھما دیا گیا۔ اب یہ نہ پوچھو کس نے کیا کیا، کیسے کیا اور کیوں کیا۔ بس یہ دیکھو کہ کب کیا۔''

عرض کیا ''دیکھو تم پھر سن اور سمبت کے پھیر میں پڑ گئے۔ ایک مفکر کہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔''

بات کاٹ کر بولے ''بھئی تم اپنے اچھے بھلے خیالات بڑے آدمیوں سے کیوں منسوب کر دیتے ہو؟ لوگ غور سے نہیں سنتے۔''

مکرّر عرض کیا ''واقعی ایک مُفکّر کہتا ہے کہ عظیم انقلابات کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی۔ تم دیکھو گے زبردست تبدیلیاں ہمیشہ دبے پاؤں آتی ہیں۔ تاریخی کیلنڈر میں ان کا کہیں ذکر نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ سکندر نے کس سن میں کون سا ملک فتح کیا۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ بن مانس کون سے سن میں انسان بنا۔ اتنا تو اسکول کے بچے بھی بتا دیں گے کہ سیفو کب پیدا ہوئی اور سقراط نے کب زہر کا پیالہ اپنے ہونٹوں سے کب لگایا، لیکن آج تک کوئی مورّخ یہ نہیں بتا سکا کہ لڑکپن کس دن رُخصت ہوا۔ لڑکی کس ساعتِ نایاب میں عورت بنی۔ جوانی کس رات ڈھلی۔ ادھیڑپن کب ختم ہوا اور بڑھاپا کس گھڑی شروع ہوا۔''

کہنے لگے ''برادر! ان سوالات کا تعلق تاریخِ یونان سے نہیں، طبِّ یونانی سے ہے۔''

سنہ عیسوی سے کہیں زیادہ مشکل ان تاریخوں کا یاد رکھنا ہے جن کے بعد میں ''قبل مسیح'' آتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں مورخین گردشِ ایّام کو پیچھے کی طرف دوڑاتے ہیں۔ ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ذہنی شیں آسن کرنا پڑتا ہے جو اتنا

دشوار ہے جتنا الٹے پہاڑے سنانا۔ اس کو طالب علم کی خوشی قسمتی کہیے کہ تاریخ قبل میلادِ مسیح نسبتاً مختصر اور ادھوری ہے۔ اگرچہ مورخین کوشاں ہیں کہ جدید تحقیق سے بے زبان بچوں کی مشکلات میں اضافہ کردیں۔ بھولے بھالے بچوں کو جب یہ بتایا جاتا ہے کہ روم کی داغ بیل ۷۵۳ قبل مسیح میں پڑی تو ننھے منے ہاتھ اٹھا کر یہ سوال کرتے ہیں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو یہ پتہ کیسے چل گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے میں ابھی ۷۵۳ سال باقی ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ ۷۵۳ ق۔م۔ کو ساتویں صدی شمار کریں یا آٹھویں۔ عقلمند اُستاد اِن جاہلانہ سوالات کا جواب عموماً خاموشی سے دیتے ہیں۔ آگے چل کہ جب یہی بچے پڑھتے ہیں کہ سکندر ۳۵۶ ق۔م۔ میں پیدا ہوا اور ۳۲۶ ق۔م۔ میں فوت ہوا تو وہ اسے کتابت کہ غلطی سمجھتے ہوئے اُستاد سے پوچھتے ہیں کہ یہ بادشاہ پیدا ہونے سے پہلے کس طرح مرا؟ اُستاد جواب دیتا ہے کہ پیارے بچو! اگلے وقتوں میں ظالم بادشاہ اسی طرح مرا کرتے تھے۔

کلاسیکی شاعر اور انشاپرداز کچھ سوچ کر چپ ہوجانے کے نازُک فن سے آشنا ہے۔ بالخصوص اُن مقامات پر جہاں لطفِ گویائی کو لذّتِ خموشی پر قربان کردینا چاہیے۔ وہ اس ''جادواں پیہم دواں، ہردم جواں'' زندگی کو وقت کے پیمانوں سے نہیں ناپتا اور سن وسال کی اُلجھنوں میں نہیں پڑتا۔ چنانچہ وہ یہ صراحت نہیں کرتا کہ جب مصر کو انطونی نے اور انطونی کو قلوپطرہ نے تسخیر کیا تو اس گرم و سیر چشیدہ ملکہ کی کیا عمر تھی۔ شیکسپیئر محض یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے کہ وقت اس کے لازوال حسن کے سامنے ٹھہر جاتا ہے، اور عمر اس کا روپ اور رس نہیں چرا سکتی۔ اس کے برخلاف مورخین نے دفتر کے دفتر اس لایعنی تحقیق میں سیاہ کر ڈالے ہیں کہ اپنے صندلی ہاتھوں کی نیلی نیلی رگوں پر اِترانے والی اس عورت کی اُس وقت کیا عمر ہوگی۔ اب ان سے کوئی یہ پوچھنے والا نہیں کہ جب خود انطونی نے امورِ سلطنت اور سنِ ولادت کے بارے میں تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا تو آپ کیوں اپنے کو اس غم میں خواہ مخواہ ہلکان کیے جارہے ہیں؟ اسی طرح جس وقت ہمارا انشاپرداز اس جِنسی جُھٹ پٹے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے جب دھوپ ڈھل جاتی ہے مگر دھرتی بھیتر ہی بھیتر میٹھی میٹھی آنچ میں تپتی رہتی ہے، تو اپنی پسند کے جواز میں بس اتنا کہہ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا دیتا ہے کہ ''چڑھتی دوپہر سے ڈھلتی چھاؤں زیادہ خوش گوار ہوتی ہے۔''

اس اعتبار سے اُن خواتیں کا کلاسیکی طرزِ عمل لائقِ تحسین و تقلید ہے، جو اپنی پیدائش کی تاریخ اور مہینہ ہمیشہ یاد رکھتی ہیں۔ لیکن سن بھول جاتی ہیں۔

اور یہ واقعہ ہے کہ حافظہ خراب ہو تو آدمی زیادہ عرصہ تک جوان رہتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وقت کا احساس بذاتِ خود ایک آزار ہے، جس کو اصطلاحاً بڑھاپا کہتے ہیں۔ ڈاکٹر جانسن نے غلط نہیں کہا ''یوں تو مجھے دو بیماریاں ہیں - دمہ اور جلندھر۔ لیکن تیسری بیماری لاعلاج ہے اور وہ ہے عمر طبعی!'' لیکن غور کیجئے تو عمر بھی ضمیر اور جوتے کی مانند ہے، جن کی موجودگی کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ تکلیف نہ دینے لگیں۔ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا کہ اگر سن پیدائش یاد رکھنے کا رواج بیک گردشِ چرخِ نیلوفری اُٹھ جائے، تو بال سفید ہونے بند ہوجائیں گے۔ یا اگر کیلنڈر ایجاد نہ ہوا ہوتا تو کسی کے دانت نہ گرتے۔ تاہم اس میں کلام نہیں کہ جس شخص نے بھی ناقابلِ تقسیم رواں دواں وقت کو پہلی بار سکینڈ، سال اور صدی میں تقسیم کیا، اس نے انسان کو صحیح معنوں میں پیری اور موت کا ذائقہ چکھایا۔ وقت کو انسان جتنی بار تقسیم کرے گا، زندگی کی رفتار اتنی ہی تیز اور نتیجۃً موت اُتنی ہی قریب ہوتی جائے گی۔ اب جب کہ زندگی اپنے آپ کو کافی کے چمچوں اور گھڑی کی ٹک ٹک سے ناپتی ہے، تہذیب یافتہ انسان اس لوٹ کر نہ آنے والے نیم روشن عہد کی طرف پیچھے مڑمڑکر دیکھتا ہے، جب وہ وقت کا شمار دل کی دھڑکنوں سے کرتا تھا اور عروسِ نو رات ڈھلنے کا اندازہ کانوں کے موتیوں کے ٹھنڈے ہونے اور ستاروں کے جھلملانے سے لگاتی تھی

نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ　　نہ شمارِ وقت وساعت
مگر اے چمکنے والو!　　ہو تمھیں انھیں سجھاتی
کہ گئی ہے رات کتنی